Urdu Studies
An international, peer-reviewed,
bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 6 │Issue 1 │Year 2026
Pages: 58-71

عتیق اللہ کی غزل گوئی

مشتاق صدف

Abstract. This Professor Atiqullah is among the distinguished contemporary critics of Urdu, yet his contribution as a poet has received comparatively less attention. His poetic journey began with Ek Sau Ghazlein (1972), followed by Bain Karta Hua Shahr (1991), Ibarat (2011), Takallum (2016), and Lakeerein (2024). His literary personality is distinguished by his command of both poetry and criticism, fields in which he demonstrates creative individuality, intellectual depth, and a remarkable breadth of reading. The coexistence of his poetic sensibility and critical insight reflects his multifaceted literary talent. His work exemplifies the rare ability to excel in both creative expression and critical discourse within contemporary Urdu literature.

Keywords. Atiqullah, Urdu Poetry, Literary Criticism, Poetic Collections, Creative Individuality, Critical Insight, Contemporary Urdu Literature.

اردو کے معاصر برگزیدہ نقادوں میں پروفیسر عتیق اللہ کا شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک معتبر شاعر بھی ہیں لیکن شاعر عتیق اللہ سے آشنائی کم ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ نقاد عتیق اللہ نے اپنے اندر کے شاعر کو شعوری اور لاشعوری طور پر بہت نمایاں نہیں ہونے دیا۔ تاہم خوشبو خوشبو ہوتی ہے۔ اس کا رشتہ ہوا سے کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتے رہے ہیں اور تنقید و تحقیق بھی۔ دنیاے شاعری میں

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on October 23, 2026
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/

۱۹۷۲ میں وہ اپنی پہلی تصنیف "ایک سو غزلیں" لے کر آئے تو سب کو حیران کر دیا۔ درمیان میں انھوں نے شاعری تو کی لیکن کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ ایک طویل عرصہ بعد ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "بین کرتا ہوا شہر" ۱۹۹۱ میں، تیسرا مجموعۂ غزل "عبارت" ۲۰۱۱ میں، چوتھا مجموعہ "تکلم" ۲۰۱۶ میں اور پانچواں شعری مجموعہ "لکیریں" ۲۰۲۴ میں منظر عام پر آیا۔ ان کا انفراد یہ ہے کہ ایک ہی کینوس پر ان کا تخلیقی تاثر الگ اور تنقیدی تاثر بالکل الگ نظر آتا ہے۔ یہ ان کی خداداد صلاحیت اور وسعت مطالعہ کی دین ہے۔ اردو میں ایسے کم نقاد ہیں جو شاعری اور تنقید دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہوں۔ جہاں تک ان کی شاعری میں وسعت فکر، موضوعات میں رنگارنگی اور مقناطیسی جوہر کی بات ہے تو مجھے یہاں غالب یاد آتے ہیں:

ایک دو ہوں تو سحر چشم کہوں　　　کارخانہ ہے واں تو جادو کا

پروفیسر عتیق اللہ کے شعری مجموعوں "ایک سو غزلیں"، "عبارت" اور "لکیریں" کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے زبان و بیان اور ڈکشن میں کسی طرح کی ناہمواری اور بے ڈھنگا پن نظر نہیں آتا اور نہ ہی ان کے فکر و خیال اور شعریات میں کسی نوع کی کجروی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تنقیدی زبان کچھ مشکل ضرور ہے لیکن شاعری میں انھوں نے عامتہ الناس کی زبان برتی ہے۔ پیچیدہ اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا ہے۔ انھوں نے خارجی اور داخلی جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے اپنے ارد گرد کے الفاظ کو ہی اہمیت دی ہے۔ ان کے فکر و خیال میں اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے زبان و بیان کا انداز آسان، سادہ اور سہل ہے۔ لیکن اس کے حسن میں جو نکھار ہے، اور جو مانوسیت ہے اس سے ان کی شاعری سادگی میں قیامت کی سی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی قوت متخیلہ پر جو شاعری کا منفرد رنگ غالب دکھائی دیتا ہے وہ آسان لفظوں کی بدولت ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے اولین شعری مجموعہ "ایک سو غزلیں" میں کچھ غزلیں اس درجہ پر التہاب اور جوش و خروش سے عبارت ہیں کہ فکر و خیال کے سامنے زبان و بیان کی خوبصورتی دب سی گئی ہے۔ نیز خیالات کے فشار میں زبان متاثر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بات ان کی چند غزلوں تک محدود ہے۔ یہ رنگ و آہنگ بعد کی شاعری میں دور دور تک نہیں ملتا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری

میں مشکل اور پیچیدہ طرز اظہار سے اجتناب کیا ہے۔ بلکہ ان کا ہر شعر کثرت معنی کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں استعمال کیے گئے الفاظ اور تراکیب پر شوکت بھی ہیں اور معنی کے مختلف رنگ سے لیس بھی۔ انھوں نے سہل ممتنع میں عمدہ شاعری کی ہے۔ اردو قارئین کا ایک بڑا حلقہ سریع الفہم اشعار کو ہی پسند کرتا ہے۔ اس میں عتیق اللہ بہت کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ ان کے سریع الفہم اشعار میں پیچیدگی اور الجھاؤ کی شکایت کرتے ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ کے تیسرے مجموعے "لکیریں" کی پہلی غزل پر جب میری نگاہ پڑی تو غالب کی وہ غزل ذہن ودل میں رقص کرنے لگی جو نسخۂ حمیدیہ میں آخری غزل ہے، جس پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب "غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات" میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی آخری اور "لکیریں" کی پہلی غزل، گویا ان دونوں غزلوں میں، فکری اعتبار سے کچھ مماثلت اور قربت ہے۔ غالب کی غزل کا مطلع ہے:

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

عتیق اللہ کی غزل کے دو شعر دیکھیے:

آنکھوں میں چمک چہرے پہ کچھ آب تو آئے
تعبیر جداگانہ سہی، خواب تو آئے
پوچھیں گے تہہ آب کے اسرار اسی سے
جو ڈوب گیا ہے وہ سر آب تو آئے

پہلی مماثلت قافیہ کی ہے اور ردیف معمولی فرق کے ساتھ موجود ہے۔ غالب کی غزل کی ردیف "تو دے" ہے جبکہ عتیق اللہ کی غزل کی ردیف "تو آئے" ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ دونوں غزلوں کے متن میں جدلیاتی وضع کارفرما ہے۔ اور ندرت خیال، طرفگی خیال، لب ولہجہ اور انداز بیان میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ اگر ہم غالب کے اول شعر کی ردیف کی باریکیوں پر نگاہ ڈالیں جس کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کیا ہے تو پھر عتیق اللہ کے سادے مگر گہرے اشعار کو سمجھنا بہت

آسان ہو جاتا ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مضمون الگ الگ ہونے کے باوجود ردیف نے دونوں ہی غزلوں کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ غالب کے شعر کا جو حسن پروفیسر نارنگ نے بیان کیا ہے خصوصاً ردیف کے تعلق سے اس کا پورا اطلاق پروفیسر عتیق اللہ کے اشعار پر بھی ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے غالب کی اس غزل اور اس کے پہلے شعر کی گرہوں کو اس طرح سے کھولا ہے:

> نسخہ حمیدیہ کے آخر کی غزل ہے۔ ظاہری ملفوظی ساخت سے ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ متن کی گہرائی میں جدلیاتی وضع کارگر ہے۔ اور طرفگی اور لطف بیان کی جڑیں اوپری سطح پر نہیں ہیں۔ نفی کا پہلا بیج ردیف 'تودے' کی 'تو' میں ہے جس پر طباطبائی نے انگلی رکھی ہے کہ مطلع میں پہلے مصرع کا 'تو' امکان کے معنی رکھتا ہے یعنی خواب میسر آنا ممکن ہے۔ دوسرے مصرع میں خواب کے لیے 'تو' کے معنی خواب کے امکان کی نفی کے ہیں یعنی خواب ہی کا آنا بڑی چیز ہے۔ کشاکش معنی کا تناؤ ظاہر ہے (۳۷۶)۔

نارنگ نے غالب کی مذکورہ غزل کی ردیف میں "تو" کی جو توضیح پیش کی ہے اور نفی کا جو پہلو اخذ کیا ہے، اگر ہم من وعن یہی توضیح عتیق اللہ صاحب کی ردیف کے "تو" سے کریں تو، امکان کی نفی، اور معنی کا تناؤ، ددونوں کی وضاحت ہو جاتی ہے اور خواب تو دے، اور خواب تو آئے، کے درمیان قربت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عتیق اللہ نے اپنی غزلیہ کائنات کو کئی نئے زاویے بخشے ہیں، لیکن نہ جانے کیوں انھیں بحیثیت نقاد زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ حالانکہ وہ ایک انتہائی معتبر شاعر ہیں۔ ممکن ہے تنقید کی شہرت نے شاعری کی شہرت کو متاثر کر دیا ہو۔ انھوں نے فکر کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ دوسرے شعرا کی طرح عتیق اللہ نے بھی بحیثیت شاعر گذشتہ عہد کو اپنے فکر و فن کے آئینے میں دیکھا۔ انھوں نے گذشتہ زمانے کے بہت سارے جذباتی یا فکری تاویلات سے خود اپنی ذات کو روشن کیا۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو فکر کی بھٹی میں تپ کر داغ نہاں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے اور اس کی معنوی خوبیوں پر غور کرنے سے کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ ہم نئی نئی تعبیرات سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں، کچھ نئی نئی

چیزوں سے آشنا ہو رہے ہیں۔ یہ خوبی ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔ وہ ماضی سے زیادہ حال کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ انسانیت کے شاعر ہیں۔ ان کا شاید ہی کوئی ایسا شعر ہو جو زندگی سے الگ ہو۔ ان کی غزلوں میں جو آہ و بکا، آنسو، خواب، تبسم، خوشی اور خیال کی جگمگاہٹ ہے وہ انسانی شعور میں ایک بیش قیمتی شے کی حیثیت رکھتی ہے، اور جو عہد نو سے وابستہ ہے۔ آج کے تغیر پذیر معاشرے میں روایت سے ہٹ کر تبدیل ہوتے ہوئے حالات سے جڑی ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں میں ظاہری اور باطنی فکر بھی بہت عیاں ہے۔ چند شعر دیکھیے:

اتفاق ایسا بھی اک روز میسر آئے
دور سے اپنے کو حالات کی زد پر دیکھیں

ہوا کی جلتی ہوئی پیٹھ چھو سکا نہ کوئی
کچھ ایسا دور تھا خالی سبھی کا وار گیا

ہم نے سمندروں کی تہوں میں گزار دی
وہ زندگی کہ جس کی بناوٹ میں آگ تھی

اس قدر اپنے نواح و گرد سے بیزار ہوں
آج میں بے موت مرنے کے لیے تیار ہوں

کھرچ رہا ہے کوئی مجھ کو دیر سے اندر
لہولہان ہوا تھا میں بار بار نہ یوں

پروفیسر عتیق اللہ اپنے پہناوے، اور حلیے سے ظاہری طور پر صوفی تو نظر نہیں آتے لیکن صوفیوں والی فکر سے ان کی شخصیت اور کلام دونوں ہی آراستہ نظر آتے ہیں۔ وہ صوفیوں کی طرح زندگی کے بھید کھولنا چاہتے ہیں۔ وہ عملی صوفی نہیں بلکہ علمی صوفی زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایسے علمی صوفی ہیں جو دنیا سے بے تعلق نہیں ہے۔ ان کے یہاں وجدانی باتیں علمی رخ پیش کرتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی شاعری میں زندگی کے راز کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اسے پیش کر دیتے ہیں۔ عتیق اللہ کسی بھی حقیقت کا احساس اپنی باطنی قوت سے کرتے ہیں۔ ان کا وجدان حقیقت کا احساس دلاتا ہے۔ ان کے

مشاہدے اور تجربے میں کوئی شامل ہو یا نہ ہو لیکن شاعر کی اندرونی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی عملی تصوف نہیں بلکہ علمی تصوف ہی نظر آتا ہے۔ شاعر عتیق اللہ کی غزلیہ شاعری آزاد خیالی اور زندگی کے اعلیٰ ترین حقائق کی جستجو سے عبارت ہے۔ جو تغیر پذیر ہے۔ وہ رسوم و قیود سے آزاد ہو کر حیات و موت کی کشمکش میں خود کو شامل رکھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح ایک صوفی باطن، عشق اور طریقت پر اصرار کرتا ہے، اسی طرح ان کے یہاں بھی باطن اور عشق پر زور دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑی حقیقت اور بلند و بالا مسیحائی کی جستجو کرتے ہیں۔ جس سے انسان اپنی منزل پا لیتا ہے۔ وہ حقیقت یعنی خدا سے دوری کو دوزخ کہتے ہیں۔ خدا سے ان کا رشتہ انسانی نوعیت کا ہے، کوئی پروفیشنل رشتہ ان کا خدا سے نہیں اور یہ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ پروفیسر عتیق اللہ کی نظر میں نجات کا راستہ جنت کو جاتا ہے اور غالب کی فکر بھی یہی ہے لیکن غالب اپنے خاص طریقۂ اسلوب سے جنت سے دوزخ کو ملانے کی بات کرتے ہیں۔

دراصل پروفیسر عتیق اللہ زاہدوں اور فقیہوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ گمراہی کے راستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ اگر ہم انھیں فلسفۂ تصوف کی کسوٹی پر پرکھیں تو یہ لگتا ہے کہ وہ زندگی کے بھید بھرے سنگیت میں خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ وجود کی ماہیت کی فہم کے متمنی بھی ہیں اور وہ صوفیوں کی طرح حیات و کائنات کے حقائق جاننے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب الگ نوعیت کا ہے۔ ہم ان کے اسلوب کو ان کی شخصیت اور بصیرت سے منہا کر کے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ جب ہم انھیں شعری لفظیات میں تحلیل کر کے دیکھتے ہیں تو ان کا اصل شعری اسلوب سامنے آتا ہے۔ ہم ان کو ان کے ڈکشن میں تحلیل کر کے دیکھتے ہیں تو ان کا منفرد انداز بیان خلق ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے لفظی احساسات سے طرز بیان کی تمام خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کے داخلی امتیازات کا اثر ان کے اسلوب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ منفرد انداز بیان اور شعری طرز ادا حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنی پوری عمر شعر و ادب میں کھپا دی ہے۔

شاعر اپنے منفرد ڈکشن اور آہنگ سے پہچانا جاتا ہے۔ سو عتیق اللہ بھی اپنے منفرد ڈکشن اور لفظیات کے استعمال سے دور سے ہی پہچانے گئے۔ ان کے یہاں نت نئے سادہ اور معنی خیز تہذیبی و

ثقافتی ڈکشن، کلاسیکی اور عشقیہ ڈکشن، جدید و مابعد جدید ڈکشن، علامتی ڈکشن، مزاحمتی ڈکشن، ترقی پسند ڈکشن، صوفیانہ اور روحانی ڈکشن کا چونکا دینے والا استعمال نئے نئے زاویوں سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کی شاعری نئے لسانی تجربات اور گہرے فلسفیانہ افکار سے آراستہ بھی نظر آتی ہے۔ ان کے شاعرانہ ڈکشن کو نئے سیاق میں نئے معنی کے ساتھ دیکھا جانا چاہیے۔ ان کی لفظیات کا ذخیرہ نیا رنگ لیے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ایسے ایسے الفاظ کو برتا ہے جنھیں بڑے بڑے شعرا نے بھی استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اسی لیے ان کی لفظیات میں کہیں کہیں اجنبیت کا احساس بھی ہوتا ہے اور کہیں ناآشنائی بھی۔ ان کی شاعری میں داخلی احساسات و جذبات کو نمایاں کرنے والے الفاظ بھی نئے انداز سے برتے گئے ہیں۔ ذات کی نفی، ذات کا کرب، زندگی کا درد وغیرہ بیان کرنے والے وجودی لفظیات کے استعمال سے ان کی شاعری ایک الگ فلسفیانہ گہرائی رکھتی ہے۔ عام فہم، سادہ اور سلیس لفظیات سے بھی انہوں نے اشعار کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ وجودیت کا اظہار کرنے والے ڈکشن سے شاعر عتیق اللہ کے یہاں ذات کی نفی، زندگی کا کرب اور تنہائی کی کسک کے ساتھ وجودی مشکلات و مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

تہذیبی و ثقافتی اور فکری استعاروں کے کثرت استعمال سے بھی ان کے یہاں ایک الگ نوعیت کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف قسم کی لفظیات اور بلیغ تراکیب کا خوب استعمال ہوا ہے۔ ان کی لفظیات میں ایک عجب طرح کی کشش ہے جو معنی کو پلٹ دیتی ہے۔ منفرد ڈکشن کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

میں بار بار گلاٹیں لگاتے جاتا ہوں
بجابجا کے کوئی ڈگڈگی نچاتا ہے

آنسوؤں پر نماز پڑھتا ہوں
ایک آواز تھی اذان جیسی

بدن کا سارا تناؤ آنکھوں میں کھینچ گیا تھا
مگر وہ دلدل جو ہڈیوں میں پھنسا ہوا تھا

ابھی تو کانٹوں بھری جھاڑیوں میں اٹکا ہے
کبھی دکھائی دیا تھا ہرا بھرا وہ بھی
اپنے سوکھے ہوئے گلدان کا غم ہے مجھ کو
آنکھ میں اشک کا قطرہ بھی نہیں ہے کوئی
وہ رات نیند کی دہلیز پر تمام ہوئی
ابھی تو خواب پہ اک اور خواب دھرنا تھا

اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ ایک تاریخی رجحان سے بھی عبارت ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی نظموں میں طنز و مزاح کی شدت پیدا کرنے کے لیے انگریزی لفظوں کا خوب استعمال کیا۔ جدید اردو شاعری میں بہت کم شعرا ہی ایسے ہیں جن کے یہاں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ ملتا ہے۔ ان میں ناصر شہزاد (۱۹۳۷-۲۰۰۷) اور پروفیسر عتیق اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں شعرانے اردو شاعری میں جدید ٹیکنالوجی اور انگریزی کے مقبول عام الفاظ کو حسب ضرورت برتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے سلیٹ، ہرکیولسی، گلوب، شوکیس، کلنڈر، بلڈنگ، ہوٹل، کلاؤن، شاک جیسے انگنت انگریزی کے الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں۔ انہوں نے انگریزی کے ان الفاظ اور اصطلاحات کو بھی استعمال کیا ہے جن کا اردو متبادل پر اثر نہیں ہوتا۔ یوں تو اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کے استعمال پر منفی اور مثبت دونوں طرح کی بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ ہمارے کچھ نقادوں کا کہنا ہے کہ اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال سے اردو کی اصل روح متاثر ہوتی ہے اور کچھ کا یہ کہنا کہ اردو یا کوئی بھی زبان چونکہ ایک زندہ اکائی ہوتی ہے اس لیے انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز مناسب نہیں۔ اس سے اردو کے ذخیرے میں اضافہ ہی ہوگا۔ جدید دور کے احساسات کے اظہار کے لیے بھی عصری لفظیات کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ انگریزی کا ایک لفظ فیس ہے جس کا اردو متبادل چہرہ ہے۔ یہ دونوں الفاظ اردو میں سمجھے اور بولے جاتے ہیں۔ لفظ چہرہ پر بے شمار اردو کے اشعار ملتے ہیں۔ ناصر شہزاد نے حسب ضرورت "چہرہ" بھی استعمال کیا ہے اور "فیس" بھی۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے جس میں "فیس" لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ اور جس سے شعر کی معنویت کم نہیں ہوتی:

چوکھٹا دل کا یہاں ہے ہو بہو تجھ سا کوئی
ہونٹ بھی آنکھیں بھی چھپ ڈھب بھی تجھی سا فیس بھی

اب پروفیسر عتیق اللہ کے کچھ ایسے ہی اشعار بطور نمونہ دیکھیے جن میں انھوں نے بڑی فنکاری سے انگریزی لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ یہ بھی محسوس کیجیے کہ انگریزی لفظیات سے ان کے اشعار کی جدت اور معنویت میں کس قدر اضافہ ہوا ہے اور ہم کس طرح اپنی تہذیبی، ثقافتی رجحان و بحران کو اردو کی طرح انگریزی لفظوں کے توسط سے بھی محسوس کر لیتے ہیں:

سلیٹ پر سے ترا نام اب مٹا بھی چکا
نئے سرے سے مجھے وسوسے میں ڈال نہ اب

کہاں سے لاؤں میں ہر کیولسی توانائی
گلوب ہاتھ میں لیتا ہوں توڑ دیتا ہوں

کہیں سے کانچ کی سل سر پہ ٹوٹ جائے گی
کسے تو جسم کے شوکیس میں سجاتا ہے

پروفیسر عتیق اللہ کی غزلوں میں زمین، مٹی، ثقافت اور روزمرہ کی زندگی سے جڑی عام اشیاء ڈکشن کا حصہ بنی ہیں۔ جن سے ان کے شعری ڈکشن (Poetic Diction) کی گہری معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے مقامی استعاروں کا تخلیقی استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں فکری اور معنوی ڈکشن کا بھی استعمال ملتا ہے۔ تہذیبی و ثقافتی روایات اور کچھ علامتی چرند و پرند، جانور، کیڑے مکوڑے وغیرہ کے اظہار سے انہوں نے اردو شاعری کی جو امیج سازی کی ہے وہ بھی انھیں سے وابستہ ہے۔ انہوں نے مخصوص لفظیات اخذ بھی کی ہیں۔ اپنی مخصوص لفظیات اور ڈکشن کی وجہ سے پروفیسر عتیق اللہ کی شاعرانہ قدر و قیمت مسلم ہوئی ہے۔ انھوں نے کانچ کی سل، پتھر کی سل، ڈگڈگی، گلاٹیں لگانا، بجلی کا کھمبا، بجلی کا پنکھا، گدھ، رینگنا، چمگادڑ، ناخن گڑونا، باگڑ، تڑے مڑے ہونا، منڈی کٹانا، چھپکلی، خندقیں، کینچلی، ڈائن، اڑن کھٹولا، سنپولہ، ڈیوڑھی، اژدہا، ریل کی پٹری جیسی لفظیات استعمال کر کے شاعری کے کینوس کو وسیع تر کیا ہے۔ چند مثالیں خاطر نشان ہوں:

یہاں تو جو بھی ہے منڈی کٹائے بیٹھا ہے
تو اپنے سر کی بلا دوسرے پہ ٹال نہ اب

تڑے مڑے ہوئے دست اور پا کا نقشہ ہوں
مقدروں کی اداکاریوں کا مارا ہوا

خود اپنے آپ میں ناخن گڑوئے جاتا ہوں
لہو لہان تھا اور قہقہے لگاتا تھا

سنپولے تیر رہے تھے لہو کی باگڑ میں
میں بھاگتا تھا وہ مجھ کو گلے لگاتا تھا

پروفیسر عتیق اللہ کی شعری کائنات کے بہت سارے گوشے ایسے ہیں جن کو آج کھنگالنے کی ضرورت ہے۔ ان کے تخلیقی سفر، ذہن و دل اور زندگی کی بہت سی راہیں ایسی ہیں جو مہیب دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کی طرح ان کے بھی گنجینۂ معنی کے طلسم کے متعدد دروازے اب تک وا نہیں ہو سکے ہیں ،انھیں روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ کائنات کی تاریک تصویریں، وقت کی نزاکت، زندگی کے خلفشار، انتشار، بکھراو، شکستگی، تمنا، آرزو اور شکست آرزو وغیرہ زندگی کے ایسے پہلو ہیں جو ان کے شعروں میں نئی معنویت کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔ ان کی تعبیر گزشتہ تعبیروں سے مختلف ہو سکتی ہے۔ ان کے شعری متن کی اہم خوبی ایک یہ بھی ہے کہ ہر تعبیر تشنہ نظر آتی ہے۔ ان کے شہر دل میں داخل ہونا اور پھر تعبیروں کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ان کی افتادِ ذہنی یا یوں کہیں کہ ان کی سائیکی میں کوئی نہ کوئی ایسی شے موجود ہے جو ہر پرانی تعبیر کو رد کرتی ہے۔ ان کا کوئی بھی شعر معصوم نظر نہیں آتا۔ جس طرح تنقید غیر جانبدار نہیں ہو سکتی، اسی طرح ان کا کوئی بھی شعر جانبدار نہیں دکھائی دیتا۔ ان کے شعری متون کی معصومیت میں ہی کائنات کے بھید بھرے سنگیت پوشیدہ ہیں، جو ہر تعبیر میں ایک نئی تعبیر کے امکانات روشن کرتے ہیں۔ ان کے شعری متن کی معصومیت، زندگی کے چیلنجز، وقت کی قوت و گمشدگی، لمحوں کی کسک و تڑپ اور روشنی کو اندھیرا کہنے کے تخلیقی عمل کو محسوس کرنا ایک مشکل ترین عمل سے گزرنا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عرصۂ عمر تنگ تھی یوں بھی
کس نے آواز دی ٹھہرنے کو

سبھی کے ہاتھ کٹے ہیں بریدہ سر ہیں سبھی
یہ کس طرف سے نکلنے کا اتفاق ہوا

کشادہ دست ہی میرے نہ پر شکم میرا
اے میرے شہر کے پندار مجھ فقیر سے ڈر

ڈیرے جما لیے تھے چڑیلوں نے در بدر
کیا کرتا میں بھی اونچے درختوں پہ چڑھ گیا

عتیق اللہ نے انسان کی بکھرتی ہوئی شناخت اور آدمی کے تصور کو ایک نیازاویہ عطا کیا ہے۔ ان کی نظر میں انسان تماشا اور لطیفہ بن چکا ہے۔ آدمی بہروپیا ہے اور لوگ تو اب کارٹونوں کی طرح نظر آنے لگے ہیں، اس لیے اب آدمی کی تشکیل کسی جادو سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اندر باہر کا آدمی اور انسان کے حوالے سے عصریت اور ارضیت کو مزید ان شعروں میں محسوس کیجیے:

اب خدا کی برکتوں کے دن گئے
آدمی پھر اک لطیفہ بن گیا

کارٹونوں کی طرح لوگ نظر آتے ہیں
آدمی دوسرا جادو سے بنائے کوئی

ہر بار وار کرتا ہے ہر بار خود کشی
بہروپ بن کے رہ گیا اندر کا آدمی

انسان کی شکستہ ذات، اس کی کشمکش، اس کی مایوسی اور اس کی بے زبانیاں وقت کی دہلیز پر سرنگوں ہیں۔ ایسا وقت آگیا ہے کہ انسان خود میں نظر نہیں آتا۔ وہ نشے کی طرح ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے آگیا ہے۔ ذات کا کرب ان کے ان اشعار میں دیکھیے:

مرا ہی عکس مجھے گالیاں سناتا ہے

میں چاہتا ہوں مرے سامنے نہ لا مجھ کو
ایک نشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں خود سے
اپنے نزدیک بھی مشکل سے نظر آتا ہوں
میں آگیا تھا خود اپنے ہی پاؤں کے نیچے
چلا گیا وہ مری بے زبانیاں لے کر

عتیق اللہ کا معاشرہ بدل چکا ہے۔ اس معاشرے میں سکون نام کی کوئی شے نہیں۔ زاویۂ حیات پہلے جیسا اب نہیں رہا۔ انسان کے سر کٹے ہوئے ہیں۔ اس کے ضمیر، ایمان، اخلاص، محبت سب پر سوالیہ نشان ہے۔ ثقافتی تغیرات کا زمانہ ہے۔ ہر طرف جبر و استحصال ہے۔ بربریت ہے، نا انصافی ہے۔ حرص و ہوس کی دنیا میں طاقت کا بول بالا ہے۔ حکمراں طبقہ ہر طبقے پر حاوی ہے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ دستور زندگی خطرے میں ہے۔ جسم میں لہو سے زیادہ پانی بھر گیا ہے۔ عصبیت اور تعصب زوروں پر ہے۔ فرقہ پرستی سے انسانیت جھلس رہی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی پلاسٹک کی ہڈی معلوم ہوتی ہے۔ شہر کے شہر بے آواز ہو چکا ہے۔ فضاؤں میں سناٹا ہے۔ گردش زمانہ اور تیز ابی زندگی کو عتیق اللہ کے بے لاگ انداز تکلم میں ملاحظہ کیجیے:

یہ ویرانہ نہ تھا ویران اتنا
یہ صحرا اس قدر صحرا نہیں تھا
یہ جسم ہے کوئی شہر الف لیلیٰ ہے
ہر ایک سمت جہاں کاڑھ دی گئیں کیلیں
کسی اک زخم کے لب کھل گئے تھے
میں اتنی زور سے چیخا نہیں تھا
دیکھ نظارہ اس کو کہتے ہیں
پاؤں پہ سل ہے، زیر پا ہوں میں

پروفیسر عتیق اللہ نے غزل کے صنفی مطالبات کو کہیں کہیں چیلنج کیا ہے اور صنفی جمالیات سے روگردانی بھی کی ہے۔ جس سے غزل میں نازک خیالی، خیال بندی، معنی آفرینی اور معنیاتی حسن و جمال کی تکثیری معنویت متاثر ہوتی ہے۔ ان کے تلخ و ترش لہجے اور احتجاج کی لفظی الہڑ لہروں سے ایسا ہوا ہے۔ یہاں وہ اپنے تلخ تجربات کے اظہار کے لیے مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تراش دے کسی خنجر سے میرے دست و پا
میرے حواس کو چمگادڑوں کا خون پلا
ہم زوال آمادہ تحریروں پہ سر دھنتے رہے
جس لہو کی گرم فطرت تھی وہ ٹھنڈا ہو گیا

مختصر یہ کہ پروفیسر عتیق اللہ کی غزلیہ کائنات کا معنیاتی نظام انتہائی وسیع ہے تو ان کے قارئین کی تعداد بھی لامحدود ہے۔ عتیق اللہ خود اپنی شاعری کے قاری دکھائی دیتے ہیں۔ فرانسیسی نقاد رولاں بارتھ نے کہا تھا کہ تخلیق کے بعد 'مصنف کی موت' ہو جاتی ہے اور اس کی جو بھی ملکیت ہوتی ہے وہ اس کے ہاتھ سے چلی جاتی ہے۔ جس سے قاری خود متن کی تشریح و تعبیر اخذ کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہو جاتا ہے نیز وہ تخلیق کار اور شاعر کی نیت، ارادے اور اس کی سوانح کا علم حاصل کیے بغیر متن سے لامحدود معنی نکال سکتا ہے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب شعری متن مصنف کی ذات سے جدا ہو جائے۔ پروفیسر عتیق اللہ کے غزلیہ متون کے مطالعے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف شعری متن ان کی ذات سے الگ ہو گیا ہے بلکہ وہ خود اپنی شاعری کے قاری نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کے قارئین کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ ان کا شعری تلازمہ بھی ان کی غزلیہ شاعری کا قاری ہے اور تشبیہ و استعارہ بھی۔ علامت بھی قاری ہے اور محاکات بھی، بلکہ لفظیات بھی۔ زندگی بھی اور موت بھی۔ آسمان بھی زمین بھی ہر عام و خاص بھی۔ ہم بھی اور آپ بھی۔ گویا سب کے سب ان کے شعری متون کے قاری ہیں۔ جب مصنف ہی اپنے متن کا قاری بن جائے تو اس کی تخلیقی ملکیت لازوال ہو جاتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ کی غزلیں جنہیں سحر چشم ہی نہیں جادو کے کارخانہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک پرکشش، سحر آفریں اور لازوال شعری کائنات ہے۔ جس پر ہمیشہ گفتگو اور بحث و

Urdu Studies
Vol. 6 | Issue 1 | Year 2026

مباحثے ہوتے رہیں گے اور پروفیسر عتیق اللہ ایک ممتاز اور البیلے تکثیری شاعر (Pluralist Poet) کی حیثیت سے ادبی دنیا میں زندہ و تابندہ نظر آئیں گے۔

مراجع:

عتیق اللہ۔ ایک سو غزلیں (شاعری)۔ حیدر آباد: ادارہ پیکر۔ ۱۹۷۲۔

ــــــ۔ بین کرتا ہوا شہر (شاعری)۔ دہلی: دہلی اردو اکادمی۔ ۱۹۹۱۔

ــــــ۔ لکیریں (غزلیں / نظمیں)۔ راجوری: تفہیم پبلی کیشنز۔

ــــــ۔ عبارت (مجموعہ غزل)۔ دہلی: کتابی دنیا۔ ۲۰۱۱۔

ــــــ۔ تکلم (غزلیں / نظمیں))۔ دہلی: کتابی دنیا۔ ۲۰۱۶۔

قریشی، کامل۔ (مرتب) اردو غزل۔ دہلی: ردو اکادمی۔ ۱۹۸۷۔

نارنگ، گوپی چند۔ غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات۔ نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی۔ ۲۰۱۳۔

Dr. Mushtaque Sadaf (real name Mushtaque Ahmad) holds degrees in Political Science from Aligarh Muslim University and in Urdu from Jawaharlal Nehru University, New Delhi. A critic, poet, and journalist, his research interests include literary criticism, language studies, mass media, and translation. He has authored 18 books, published over 60 research papers and literary articles, and delivered more than 70 special lectures. He is Joint Editor of *Fikr-o-Nazar*, published by AMU, and serves as Deputy Director of the Sir Syed Academy, AMU. He is also associated with the Centre for Promotion of Developing Urdu Teaching (CPDUT), Urdu Academy, AMU.